قرآن کا نظریۂ کائنات

ڈاکٹر عبدالمغنی

(قسط ۱)

فطرت و قدرت

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ

(الملک ۶۷ : ۳)

(تم رحمان کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے' پھر پلٹ کر دیکھو' کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے ؟)

فطرت و قدرت کے الفاظ عام طور پر ایک ہی معنی میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ لیکن ان کے درمیان لغت کے اعتبار سے ایک فرق ہے۔ فطرت دنیا میں پیدا ہونے والی چیزوں کی اصلیت ہے اور اس لحاظ سے ہستی کے جتنے مظاہر ہیں سب کا تعلق فطرت سے ہے۔ آدمی کے نقطۂ نظر سے ایک فطرت اس کے وجود کے اندر ہے' دوسری فطرت اس کی نگاہوں کے سامنے زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی پوری کائنات ہے۔ قدرت درحقیقت خدا کی قدرت؛ اس کی قوت و طاقت اور اس کے بنائے ہوئے اس منصوبہ و نظام کا نام ہے جو زندگی کے تمام جلوؤں اور پہلوؤں پر حاوی ہے۔ چنانچہ اگر محاورے میں فطرت کو بھی قدرت کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں وجود کے تمام مظاہر کو ایک خدا کی مخلوقات سمجھا جاتا ہے۔

فطرت و قدرت کی یہ ہم آہنگی بلاوجہ نہیں۔ یہ انسان کے ضمیر کی آواز بھی ہے اور زندگی کا قانون بھی۔ ہزاروں' لاکھوں سال سے جو کارخانۂ ہستی چل رہا ہے وہ بے بنیاد اور بے معنی نہیں۔ اس کا ایک مقصد ہے۔ آدمی کی عقل نے جس حد تک بھی اس مقصد کو سمجھا ہے اسے محسوس ہوا ہے کہ کائنات کی تخلیق کسی بالاتر ہستی کے ارادے سے' اس کے منصوبے کے مطابق ہوئی ہے اور حیات ایک نعمت ہے جو اس لیے دی گئی ہے کہ اس کے تقاضے پورے کیے اور اس کی

ذمے داریاں ادا کی جائیں۔ یہ احساس خدا کی مشیت اور اس کی بنائی ہوئی تقدیر کی طرف بہت واضح اشارہ کرتا ہے' جس سے زندگی کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ اہمیت انسان سے زندگی کے متعلق ایک سنجیدہ رویے کا مطالبہ کرتی ہے۔ دنیا کھیل تماشے کی جگہ نہیں ہے۔ یہاں زندگی کی جو نوعیت ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کچھ کر دکھانے کی جگہ ہے اور جو کچھ کیا جائے گا اس کا ایک اندازہ بھی لگایا جائے گا' جس کے مطابق کرنے والے کی حیثیت کا تعین ہوگا۔ ایسی حالت میں آدمی کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ فطرت و قدرت کی حقیقتوں' اصولوں اور مطالبوں کو سمجھ کر ان کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرے تاکہ اس کی ہستی نہ صرف باقی رہے بلکہ اسے صحیح طور پر ترقی کا موقع ملے۔

حیات و کائنات

فطرت و قدرت کی طرح حیات و کائنات کے الفاظ بھی بہ کثرت ساتھ ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں' گرچہ ان کے معنوں میں جو فرق ہے وہ لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ اس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ ہے کہ حیات و کائنات کے درمیان ایک اندرونی ربط ہے۔ حیات بغیر کائنات کے نہیں ہوسکتی' وہ کائنات کے اندر ہی ہوتی ہے اور اس کے تقاضے ایک کائنات بنا لیتے ہیں۔ اسی طرح کائنات کا کوئی تصور حیات کے بغیر معمول کے مطابق نہیں کیا جاسکتا' کائنات جب ہے تو اس میں حیات بھی ہے۔ رہا یہ سوال کہ کائنات پہلے ہے یا حیات' تو اس کا جواب آسان نہیں اور یہ مرغی پہلے کہ انڈا پہلے جیسا سوال ہوجاتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ حیات و کائنات کا وجود ساتھ ساتھ ہوا۔

بہرحال' زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ حیات و کائنات کا وجود یک بارگی ہوا یا کسی ارتقا کے نتیجے میں؟ اس سوال پر غور کرنے کے لیے اگر یہ مان لیا جائے کہ حیات و کائنات میں ترقی کا ایک سلسلہ ہے تب بھی پہلا اور بنیادی سوال یہ ہوگا کہ کائنات یا حیات کا وہ مادہ کیسے وجود میں آیا جس نے ترقی کے مدارج طے کیے؟ یہ سوال بھی ساتھ ساتھ اٹھے گا کہ کیا تمام چیزیں ایک دوسرے کے اندر سے نکلتی چلی گئی ہیں؟ ان سوالوں کے قطعی جواب دینے سے انسان کی عقل قاصر ہے' اس لیے کہ اس کے پاس کوئی ٹھوس اور واضح ثبوت اس بات کا نہیں کہ وجود کا بنیادی مادہ کب اور کیسے پیدا ہوا' پھر مختلف چیزیں کس طرح ابھرتی اور بڑھتی چلی گئیں؟

اب کائنات اور اس میں حیات کی جو شکل ہمارے سامنے ہے اور ہم نے دونوں کی حقیقت کا سراغ لگانے کے لیے جو کچھ کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم اس کے سوا کوئی اقرار نہیں کرسکتے کہ

حیات و کائنات کے متعلق ہمیں پوری سنجیدگی سے ایک رائے قائم اور ایک رویہ اختیار کرنا چاہیے' تاکہ ہم سایوں اور سرابوں کے پیچھے نہیں دوڑتے رہیں اور دھوکا نہیں کھائیں' زندگی کو برباد نہیں کریں' بلکہ حقیقتوں کو سمجھ کر' شعور کی روشنی میں اپنی قوت اور وقت کا استعمال زندگی کو نکھارنے اور سنوارنے کے لیے کریں' تاکہ ایک منزل کی طرف آگے بڑھیں' کامیابی اور ترقی کا راز اسی میں ہے۔

بنیادی رویّہ

فطرت و قدرت اور حیات و کائنات کے متعلق بنیادی طور پر انسان کے لیے ضروری ہے کہ ایک واضح رویّہ اختیار کرلے' ورنہ دنیا میں اس کی زندگی بالکل غیرفطری' نامعقول اور بے کار ہوگی۔ اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہی نہ ہو کر جو حیات اسے ملی ہے وہ کیا ہے' جس کائنات میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے اس کی کوئی حقیقت ہے اور جس فطرت پر اسے پیدا کیا گیا ہے یا وہ پیدا ہوا ہے اور جو فطرت اس کی نگاہوں کے سامنے پھیلی ہوئی ہے اس کے پیچھے کون سی قدرت کام کررہی ہے' تو ظاہر ہے کہ آنکھوں کے باوجود اس شخص کی زندگی ایک اندھے کی ہوگی' ایک ایسے اندھے کی جس کے سر اور دل دونوں کی آنکھیں بند ہوں گی' جس کا نہ کوئی ذہن و دماغ ہوگا نہ شعور و کردار' وہ حیوان سے بھی بدتر ہوگا اور اس کا شمار نباتات و جمادات میں کیا جائے گا۔

یہ بنیادی رویّہ دو قسم کا ہوسکتا ہے' ایک یقینی' ایک غیر یقینی۔ تمام مشاہدات و تجربات کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ فطرت و قدرت اور حیات و کائنات کی اصلیت و حقیقت کا معاملہ غیب کا ہے اور صورت یہ ہے کہ اس کے متعلق یا تو کسی یقینی ذریعے سے کوئی واضح علم حاصل ہوجائے یا بالکل غیریقینی طور پر صرف قیاس و تخمین سے کام لیا جائے۔ دونوں صورتوں میں کچھ دلیلیں ہوں گی' لیکن جو دلیل شک اور گمان کی بنا پر دی جائے گی ظاہر ہے کہ اس سے زندگی کا کوئی ٹھوس عمل پیدا نہیں ہوگا' جب کہ یقین و اعتماد پر مبنی دلیل لازماً ایک ٹھوس عمل کی تحریک کرے گی۔ اس طرح زندگی کے متعلق دو مختلف بلکہ متضاد رویے رونما ہوں گے اور ان کے مخصوص نتائج بھی برآمد ہوں گے۔

اس سلسلے میں رویوں کی سب سے واضح تقسیم یہ ہے کہ ایک رویہ مذہب کا ہے جس کی بنیاد وحیٔ الٰہی پر ہے اور دوسرا رویہ لامذہبیت کا ہے جو آدمی کے عقلی قیاسات پر مبنی ہے۔ وحی کا صاف اقرار ایمان کی شان ہے اور وحی سے انکار یا اس کے متعلق تذبذب بے دینی کی کیفیت ہے۔ فطرت و قدرت اور حیات و کائنات کی معروف عالمانہ و حکیمانہ تحقیق دونوں حالتوں میں ممکن ہے

مگر ان کے نتائج اور اثرات ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوں گے۔ وحی پر ایمان کے ساتھ انفس و آفاق کا جو مشاہدہ و مطالعہ ہوگا وہ ایک مثبت ضابطۂ عمل مرتب کرے گا' جبکہ اس ایمان کے بغیر زندگی کے مظاہر کا جو تجسس کیا جائے گا اس میں منفی قسم کی فکری تشکیک پائی جائے گی۔

پرانے زمانے میں ان رویوں کی باہمی آویزش کو مذہب اور سائنس کی کش مکش سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ تعبیر صحیح نہیں تھی۔ سائنس کے لیے لامذہب ہونا ضروری نہیں اور مذہب کے لیے لازمی نہیں کہ وہ سائنس کی مخالفت کرے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ایک سائنس مذہب پسند ہو اور دوسری مذہب بے زار' یہ فرق بھی دراصل سائنس دان کے ذاتی رویے پر منحصر ہے' ورنہ سائنس بجائے خود ایک غیر جانب دار شے ہے۔جس کا استعمال کسی بھی مقصد کیلئے ہوسکتا ہے۔

سائنس کا نظریۂ کائنات

کائنات سے عالموں اور فلسفیوں کی دلچسپی بہت پرانی ہے۔ بعض اہلِ علم کے درمیان ستارہ شناسی ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ Astrology ایک پرانا فن ہے' جس میں دنیا اور آدمی کے حالات و واقعات پر ستاروں کی چال کا اثر دکھایا جاتا ہے۔ اس جنتر منتر نے بڑھ کر باضابطہ علمِ نجوم (Astronomy) کی شکل اختیار کرلی اور اس کی مزید ترقی طبعیاتِ نجوم (Astrophysics) کی تشکیل کا باعث ہوئی' یہاں تک کہ کائنات' اس کے سیاروں اور ستاروں کے مطالعے کے لیے سائنس کے ایک تازہ ترین شعبے علمِ کائنات (Cosmology) کا وجود عمل میں آیا۔ لیکن کائنات کے سارے حکیمانہ مشاہدات کی حد اس موضوع پر پیرس سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہونے والی ایک کتاب کے اس ذیلی عنوان سے معلوم ہوجاتی ہے :

Conversations about The Invisible (غیب کے متعلق گفت وگو)[1]۔

ظاہر ہے کہ غیب کے متعلق' جس کی کھلی اور قطعی شہادت کسی ٹھوس شکل میں نہیں مل سکتی' انسان کی ہر گفتگو ظن و تخمین اور قیاس و گمان پر مبنی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کے حقائق کی مادی تعبیر کے متعلق سائنس کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہہ سکتی اور اس سلسلے میں اس کا کوئی دعویٰ کسی واضح دلیل پر مبنی نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مدت تک سائنس دانوں کے درمیان یہ مباحثہ ہوتا رہا کہ کائنات ایک بار بن کر ساکن ہوگئی یا مسلسل حرکت و ترقی کررہی ہے۔ ۱۹۲۲ء سے ایک روسی سائنس دان' فریڈمین (Friedman) کائنات کے متحرک ہونے کا خیال پیش کرتا رہا' مگر ۱۹۵۰ء کی دہائی تک کائنات کی عمر کبھی دس بلین اور کبھی بیس بلین

(۱) اس گفتگو میں شریک ہونے والوں کے نام یہ ہیں :
Jean Audouze' Michel Casse 'Jean – Clawde Carriere

بتانے والے سائنس دان کائنات کی حرکت یا سکون کے متعلق اپنے اختلافات کا اظہار کرتے رہے۔ متحرک یا ساکن ہونے کے ساتھ ساتھ کائنات کے محدود یا لا محدود ہونے کی منطقی بحث بھی چلتی رہی۔

ایچ بانڈی (H.Bondy)، ٹی گولڈ (T.Gold)، فرڈ ہوائل (Fred Hoyle)، ولیم فاؤلر (William Fowler) جیسے اہلِ علم و حکمت کائنات کی تعمیرو تشکیل پر مباحثے کرتے رہے، مگر وہ کسی فیصلہ کن نتیجے تک نہیں پہنچ سکے۔ ان کی ایک بڑی الجھن اس سلسلے میں خدا کے اقرار و انکار کا مسئلہ تھا۔ سائنس دانوں نے علم کی غیر جانبداری میں اتنی انتہا پسندی کی کہ انھوں نے سائنس کو بے خدا (Atheist) تسلیم کرنا ضروری سمجھا اور اس مفروضے پر، جس کا حکیمانہ معروضیت (Scientific Objectivity) سے کوئی اصولی تعلق نہیں تھا، کائنات کے یک بارگی وجود کے بعد اس کو جامد قرار دے دیا، اس لیے کہ کائنات کی مسلسل حرکت کسی محرک کی ہستی کا تصور کرنے پر مجبور کرتی۔ یہ ایک عجیب و غریب صورتحال ہے اور بالکل محال و متضاد قسم کی ہے، ایک طرف ارتقا (Evolution) کا خیال ہے جو حرکت پر مبنی ہے اور دوسری طرف اس جمود کی وکالت ہے جو تخلیق (Creation) کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس الجھن سے محسوس ہوتا ہے کہ لادین سائنس دان نہ تو ارتقا کا مطلب ٹھیک سمجھتے ہیں نہ تخلیق کا اور ان کی جانب سے معروضیت کے سارے دعوے دراصل ایک موضوعی (Subjective) مفروضے پر قائم ہیں۔ یہ طرزِ فکر کوئی فلسفہ ہو تو ہو، سائنس نہیں ہے۔ حکمت کے لیے انکارِ خدا کیوں ضروری ہو؟ سب سے بڑا حکیم اور حکمت بخش تو خدا ہی ہے!

۱۹۶۵ء میں ضرب عظیم یا بڑی چوٹ (Big Bang) کا وہ نظریہ سامنے آیا جس کا غلغلہ آج تک بلند ہے۔ اس کے علمبردار لیمائیٹر (Lemaitre) اور گامو (Gamow) ہیں۔ اس نظریے کے مطابق کائنات کا وجود ایک بیضۂ اصلی (Original Egg) سے ہوا جس میں جوہرِ قدیم (Primordial Atom) بہت ہی بڑی مقدار میں بھرا ہوا تھا۔ اس پہلے انڈے کے اندر انتہائی کثافت (Density) کے ساتھ ساتھ حدت (Heat) بھی تھی۔ یہ بنیادی مادہ "ابتدا" اپنے زبردست حجم میں تابانی و تابکاری سے معمور تھا۔ اب دو اہم ترین سوالات اٹھتے ہیں:

۱۔ بیضۂ اصلی کے عناصر کی ترکیب کیسے عمل میں آئی؟

۲۔ اس ترکیب کو وجود کے اگلے مرحلے پر کون حرکت میں لایا؟

سائنس کے تمام مکاتبِ فکر انہی سوالوں کے جواب کی جستجو میں سرگرداں ہیں، اس لیے کہ

کائنات کی ہستی اور ترقی دونوں کا راز اسی جواب میں پوشیدہ ہے اور حیات کے اسرار و رموز بھی اس میں مضمر ہیں۔ یہ جواب وہ شاہ کلید (Master Key) ہے جس سے زندگی کے بنیادی حقائق پر لگے ہوئے سب تالے کھل جاتے ہیں اور آفاق کی صداقتوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ لیکن سائنس دانوں کی مشکل یہ ہے کہ سوالات کا تعلق درحقیقت غیب (Invisible) سے ہے اور جواب ایمان (Faith) کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتا۔ غیب اور ایمان دونوں طبعی (Physical) نہیں' مابعد طبعی (Metaphysical) امور ہیں اور علمِ کائنات کا آغاز بھی مابعد طبعی ہے' انجام بھی مابعد طبعی' لہٰذا سوالوں کے جواب سائنس سے نہیں' مذہب، سے میسر آسکتے ہیں۔

قرآن کا نظریۂ کائنات

قرآن نے پہلے پارے کی پہلی ہی سورہ کی بالکل ابتدائی آیتوں میں واضح کر دیا ہے کہ اللہ کی کتاب' جو ختم المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعے نازل کی گئی' ان لوگوں کو روشنی دکھاتی ہے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ چنانچہ کائنات و حیات کے آغاز کے متعلق' جو سراسر غیب کا معاملہ ہے' قرآن حکیم کی حسبِ ذیل آیت ایک واضح اعلان کرتی ہے :

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ○ (الانبیاء ۲۱ : ۳۰)

(کیا وہ لوگ جنہوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے' پھر ہم نے انہیں جدا کیا' اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی ؟ کیا وہ ہماری اس خلاقی کو نہیں مانتے ؟)

اس کے فوراً بعد کی آیتوں میں تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ خدا نے :

۱ - زمین میں پہاڑ جما دیے' تاکہ وہ ڈھلک نہ جائے' اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں' شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر لیں۔

۲ - آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا۔

۳ - رات اور دن بنائے۔

۴ - سورج اور چاند کو پیدا کیا۔

۵ - سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔ (الانبیا ۲۱ : ۳۱ - ۳۳)

آخری نکتے پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا تفسیری نوٹ یہ ہے :

"فلک' جو فارسی کے چرخ اور گردوں کا ٹھیک ہم معنی ہے' عربی زبان میں آسمان کے معروف ناموں میں سے ہے۔ "سب ایک فلک میں تیر رہے ہیں" سے دو باتیں صاف سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ سب تارے ایک ہی "فلک" میں نہیں ہیں بلکہ ہر ایک کا فلک الگ ہے۔ دوسرا یہ کہ فلک کوئی ایسی چیز نہیں جس میں یہ تارے کھونٹیوں کی طرح جڑے ہوئے ہوں اور وہ خود انہیں لیے ہوئے گھوم رہا ہو بلکہ وہ کوئی سیال شے ہے یا فضا اور خلا کی سی نوعیت کی چیز ہے جس میں ان تاروں کی حرکت تیرنے کے فعل سے مشابہت رکھتی ہے۔(ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی از سید ابوالاعلیٰ مودودی" ۱۹۷۸ء' اشاعتِ اسلام ٹرسٹ' دہلی)

مذکورہ بالا سورہ الانبیاء کی آیت نمبر ۳۰ کیا کائنات کی تخلیق کے متعلق سائنس کے جدید ترین نظریے Big Bang کی طرف کھلا اشارہ نہیں کرتی ؟ قرآن مجید کے الفاظ پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے' پھر ہم نے انہیں جدا کیا" اس بیضۂ اصلی پر ایک ضربِ عظیم کا بیان ہے جس کی بات سائنس کرتی ہے۔ قرآن کے الفاظ صریحاً" زمین و آسمان کی مرکب شکل کے ٹوٹنے کا تذکرہ کرتے ہیں' یعنی ابتدائے کائنات میں جب وجود کے عناصرِ ترکیبی ایک دوسرے میں خلط ملط تھے ایک زور دار دھماکہ (Explosion) خدا کے حکم سے' اس کی مشیت کے مطابق ہوا' جس کے بعد ہستی کا ارتقا اگلے مراحل میں داخل ہوا۔ دھماکے سے پہلے بھی جو عناصر پیدا ہو کر ایک مرکب شکل میں یک جا ہوئے وہ خدا کی قدرت ہی کا کرشمہ تھا۔ وہی تمام چیزوں کا خالق ہے۔ عناصرِ وجود کی تخلیق' تحلیل اور ترکیب سب کچھ اس کی قدرت و مشیت کے تحت ہی ہوا ہے' ہو رہا ہے اور ہو گا۔

اس سلسلے میں زیرِ بحث آیت کا یہ جملہ کہ "پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی" کائنات اور اس میں حیات کی تخلیق و ترقی کے متعلق سائنس کی ایک اہم تصور پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سائنس نے جو نظریہ مشاہدے اور تجربے کے بعد قائم کیا اس کی طرف اللہ کی کتاب وحی کے ذریعے واضح اشارہ کرتی ہے۔ قرآن مجید کا فکر انگیز جملہ بالکل عام اور جامع ہے تمام زندہ چیزوں کے لیے' جب کہ زندگی کا اطلاق انسان اور حیوان کے علاوہ نباتات اور جمادات پر بھی ہو سکتا ہے۔ پودے جس طرح اگتے بڑھتے اور پہاڑ بنتے پھیلتے ہیں وہ زندگی کی ایک علامت ہے۔ اس لیے ہر مخلوق' زندگی کے کسی بھی دائرے میں' پانی کے مادہ حیات ہونے کی شہادت دیتی ہے' پھر پانی کو بنیادی مادہ مان کر مختلف سطحوں پر مختلف قسم کی مخلوقات کے ارتقا کا امکان بھی ہے۔ بہر حال' جو

چیز بھی پیدا ہوئی یا ہوتی ہے اس کا خالق خدا ہے اور پانی کو بھی اس نے پیدا کر کے دیگر اشیاء و مخلوقات کی تخلیق کے لیے مادے کے طور پر استعمال کیا۔

زیر بحث آیت سے متصل آیات میں زمین' پہاڑ' آسمان' رات' دن' سورج اور چاند کی تخلیق کا تذکرہ کر کے قرآن حکیم نے کائنات کے متعدد اہم ترین مظاہر کا احاطہ کر لیا ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کے ایک دوسرے سے جدا ہونے کے بعد وجود کی توسیع و ترقی اور ہستی میں اضافہ و ارتقا خدا کی قدرت و مشیت کے تحت' اس کی بنائی ہوئی تقدیر کے مطابق ہوا اور یہ جملہ کہ "سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں" یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے ایک خدائی منصوبے کے تحت' ایک خاص ترکیب و ترتیب سے ہو رہا ہے۔ سائنس اس جملے سے سیاروں اور ستاروں کا مفہوم اخذ کر سکتی ہے' جب کہ کلامِ الٰہی نے ایک جامع اصول اور ایک عام قاعدے کی وضاحت کر دی ہے۔

یہ وہ نکات ہیں جو قرآن میں مختلف مواقع پر' مختلف طریقوں سے بار بار پیش کیے گئے ہیں۔ نمونے کی چند آیتیں حسب ذیل ہیں:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ○ (البقرہ ۲ - ۱۶۴)

(جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں' رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں' ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں' بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے' پھر اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اس انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے' ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں' بے شمار نشانیاں ہیں)۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (ھود ۱۱ : ۷)

(اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ جب کہ اس سے پہلے

اس کا عرش پانی پر تھا ـــــ تاکہ تم کو آزما کر دیکھے تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔)

تفسیری نوٹ از مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ :

"ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس پانی سے مراد کیا ہے، یہی پانی جسے ہم اس نام سے جانتے ہیں یا یہ لفظ محض استعارے کے طور پر مادے کی اس مائع حالت کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو موجود صورت میں ڈھالے جانے سے پہلے تھی؟ عرش پر ہونے کا مفہوم بھی متعین کرنا مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہو کہ اس وقت خدا کی سلطنت پانی پر تھی۔"

اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (القمر ۵۴ : ۴۹)

(ہم نے ہر چیز ایک تقدیر کے ساتھ پیدا کی ہے)۔

اس آیت کی تشریح مولانا مودودیؒ نے اس طرح کی ہے :

"یعنی دنیا کی کوئی چیز بھی الل ٹپ نہیں پیدا کردی گئی ہے، بلکہ ہر چیز کی ایک تقدیر ہے جس کے مطابق وہ ایک مقرر وقت پر بنتی ہے۔ ایک خاص شکل اختیار کرتی ہے، ایک خاص حد تک نشوونما پاتی ہے، ایک خاص مدت تک باقی رہتی ہے اور ایک خاص وقت پر ختم ہوجاتی ہے۔"

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۝ (الطلاق ۶۵ : ۱۲)

(اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہی کے مانند۔ ان کے درمیان حکم نازل ہوتا رہتا ہے۔ یہ بات تمہیں اس لیے بتائی جارہی ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور یہ کہ اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے)۔

آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ کہتے ہیں :

"انہی کے مانند" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جتنے آسمان بنائے اتنی ہی زمینیں بھی بنائیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسے متعدد آسمان اس نے بنائے ہیں ویسی ہی متعدد زمینیں بھی بنائی ہیں۔ اور "زمین کی قسم سے" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ زمین جس پر انسان رہتے ہیں اپنی موجودات کے لیے فرش اور گہوارہ بنی ہوئی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات میں اور زمینیں بھی بنا رکھی ہیں جو اپنی اپنی آبادیوں کے لیے فرش اور

بقیہ بر صفحہ ۳۶